AL-JAMEI Research Journal
ISSN (Print) 3006-4775 (Online) 3006-4783
https://aljamei.com/index.php/ajrj

Social conflict and economic instability in Urdu fiction

اردو افسانوں میں معاشرتی کشمکش اور اقتصادی عدم استحکام

Sajjad Ahmad
Visiting Faculty Member, PhD Urdu Scholar, Federal Urdu University Islamabad
Ali Raza
MPhil Scholar, Government College University, Faisalabad
Mumtaz Hussain Kharal
Head Master Government Primary School Kharlwala
Dr. Shumaila Mushtaq Ahmad
Lecturer, Government Graduate Women's College Chiniot

Abstract:

The study of Urdu short stories reveals a significant theme of protest, rooted in the contradictions of political and social systems. This theme reflects the shattered dreams of a healthy life and a bright future that were associated with pre-independence aspirations. The post-independence era has brought profound societal changes, leading to mental turmoil, loneliness, and fear among individuals. While these changes have created instability and uncertainty, they have also prompted a new understanding of societal issues and progress. The concept of rural life has transformed, with many individuals transitioning to urban struggles. The constant challenges of urban life have alienated individuals, stripping them of their sense of stability and security. This evolving situation has notably influenced our society and literature, particularly visible in the works of contemporary short story writers.

Keywords: *Protest, Dreams, Turmoil, Loneliness, Fear, Instability, Uncertainty, Rural, Urban*

تعارف

آزادی کے بعد انسانی زندگی میں تغیر اور تبدیلی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آزادی کے بعد ہندوستانی سماج کے مسائل نہ ہونے کے خاتمے کے بعد اقتصادی بدحالی، ظلم و جبر، غربت، استحصال، زمین داروں کا تسلط اور بے گاری کے علاوہ زمین داری کے خاتمے کے بعد اقتصادی سطح پر جس طبقے کو کئی المناک حادثات سے گزرنا پڑا اُن تمام حادثات کا اضافہ ہو گا۔

جیسا کہ ظاہر ہے ہندوستان کسانوں کا ملک رہا ہے۔ لہٰذا آزادی سے قبل ہندوستان میں مزدور اور کسان بڑی تلخ زندگی گزار رہے تھے۔ لہٰذا اس تلخ زندگی سے بوجھل ہر کر انھوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا شروع کر دی۔ جو آزادی کے بعد کافی تیزی سے بڑھی اور ایک حد تک کامیاب بھی رہی۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی ان کی حیثیت اور معاشی زندگی کے معیار کو اونچا اُٹھانے میں وہ ناکامیاب رہے۔ زمین داری کے خاتمے کے بعد بے زمین مزدور کے آگے معاش کا کوئی ذریعہ نہیں رہا یا تو اس کا پھر استحصال ہوا یا پھر اس نے اپنی زندگی کو شہر میں جا کر اس قدر المناک بنالیا کہ زندگی کا خاتمہ غلاظت اور بدبو کے ساتھ ہونے لگا۔

اردو ادب میں اس نئی طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا۔ سرمایہ دار طبقے کے مظالم اور مزدور طبقے کی بدلتی زندگی کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کی گئی۔ نچلے طبقے کے مسائل پر مبنی افسانے کرشن چندر کے یہاں کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''کچرا بابا'' اسی قسم کا افسانہ ہے۔ جس میں ایک طبقے کے تباہ و برباد ہونے کی کہانی ہے۔ جہاں اُس کی ساری پریشانیوں کی وجہ غربت ہے۔ بیوی کے اپنے فرم کے مالک کے ساتھ چلے جانے کے بعد مجبوری اور بھوک سے پریشان شخص حالات اور وقت کے سرد و گرم تھپیڑے سہہ کر کچرا بابا بن جاتا ہے۔ بھوک کے سبب کوڑے دان کی بدبوؤں کے درمیان بھی اُسے پوریوں اور آلو بھاجی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچرے میں پڑی چیزوں کو کھانے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی سے بیزار اس شخص کی زندگی میں نئی صبح جب آتی ہے جب اُسے کوڑے کے ڈھیر میں پڑا بچہ نظر آتا ہے جس کی پرورش کی خاطر اب وہ دوبارہ اپنی زندگی عزت سے جینے کی کوشش کرنے لگتا ہے:

> ''لوگوں نے دیکھا کہ کچرا بابا آج کچرے کے ٹب کے قریب نہیں بیٹھا ہے۔ بلکہ سڑک کے پار نئی تعمیر ہونے والی عمارت کے نیچے ہو کر اینٹیں ڈھو رہا ہے اور اس عمارت کے قریب گل مہر کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں ایک پھولدار کپڑے میں لپٹا ہوا ایک ننھا بچہ منھ میں دودھ کی چاشنی لیے مسکرا رہا ہے۔''[1]

دراصل افسانے میں کچرا بابا اُس نچلے طبقے کا نمائندہ ہے۔ جس کو وجود میں لانے کا دارومدار سرمایہ دارانہ نظام کے سر پر ہے۔ کہیں دولت کی فراوانی ہے اور کہیں غربت کے سبب ایک شخص کچرا بابا بن کر سامنے آتا ہے۔ سماج نے بھی اُسے اور اس کے زندگی کو کچرا سمجھ کر اُسے وہ نام دے دیا تھا جس پر کرشن چندر بھی طنز کرتے نظر آتے ہیں:

> ''اور اس کا اعتقاد تھا کہ اس دنیا سے نیکی ختم ہو سکتی ہے، وفا ختم ہو سکتی ہے، رفاقت ختم ہو سکتی ہے، لیکن غلاظت اور گندگی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ساری دنیا سے منھ موڑ کر اس نے جینے کا آخری طریقے سیکھ لیا تھا۔''[2]

غرض کہ کرشن چندر جہاں فرد اور معاشرے کے جن مظاہر کو انسانی دوستی کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ نہیں پاتے ان کی جانب ان کا رویہ طنز کا روپ دھار لیتا ہے۔

افسانہ ''مہالکشمی کا پل'' بھی اسی قسم کا افسانہ ہے جو اسی احتجاجی ذہنی رویوں کا مظہر ہے جو نہ صرف موجودہ سیاسی اور معاشی نظام اور استحصال پسندی پر عام ناپسندیدگی کی مہر ثابت کرتے ہیں بلکہ اپنے رہنماؤں اور سرکار کے نمائندوں سے بھی سوال کرتے نظر آتے ہیں۔ افسانے میں پل کے آس پاس رہنے والے محنت کش طبقے کی زندگی کی حقیقتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے میں کرشن چندر نے سرمایہ دار طبقے اور نچلے طبقے کے حالات کو پیش کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ سے طنزیہ انداز میں اس طرف نظر ڈالنے کی درخواست کی ہے۔ جہاں افسانے میں چھ ساڑیوں کا ذکر کر کے چھ غریب خاندانوں کے حالات کو پیش کیا ہے جو کس طرح بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ افسانے میں جابجا مظلوم طبقہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتا نظر آتا ہے:

''میں دفتر میں سیٹھ کی گلیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے، شاید اسے صرف ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول اور ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے، مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آگئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی عزم نہیں مل سکتا۔''[3]

دراصل افسانہ سیاسی رنگ لیے ہے جہاں طنزیہ انداز میں کرشن چندر ملک کے عہدے داروں کو اس طرف بھی متوجہ کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت پسندانہ کہانی ہے جو ہمارے ذہن پر گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ کرشن چندر کا افسانہ ''کالو بھنگی'' سماجی حقیقت نگاری کے سلسلے میں لکھے ہوئے افسانوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ:

''کالو بھنگی ایک گرے پڑے، روکھے پھیکے، بے مزہ اور بے رنگ کردار کی کہانی ہے جس میں کرشن چندر نے مظلوم انسانیت کے حسن کو اجاگر کیا ہے۔''[4]

یہ وہ کہانی ہے جس میں ایک شخص سماج کی پست اور ادنی طبقے کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ اپنی ذات سے تمام عمر دوسروں کو فیض پہنچاتا رہا لیکن خود نے زندگی میں کبھی کچھ نہیں پایا۔ لیکن اُس نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی نہ کوئی شکایت۔ بس ایک محور پر مقرر نظام الاوقات کے ساتھ صبح و شام اس کی زندگی گردش کرتی رہی جس کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ افسانہ نگار خود کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہے لیکن اس کی سپاٹ زندگی میں کچھ بھی تو نہیں تھا جس پر قلم اٹھایا جائے۔ لیکن افسانہ نگار کے ذہن میں کالو بھنگی ہر وقت ایک سوالیہ نشان چھوڑ جاتا ہے کہ آخر اس پر کہانی کب لکھی جائے گی اور افسانہ نگار اس کی سپاٹ زندگی کے متعلق خیالات جمع کرنا شروع کر دیتا ہے:

''کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے۔ اسی طرح اسی حالات میں، پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہ کیا تھا، حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہ کیا گیا تھا، وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اُٹھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اس طرح کرتا چلا آتا تھا۔''[5]

گویا کالو بھنگی کی زندگی میں دلچسپی کے کوئی عناصر موجود نہ تھے۔ سوائے انسانیت، معصومیت، انسانی، دوستی اور خدمت گزاری کے جذبے کے۔ اسپتال جہاں اس نے 20 سال خدمت کی اور بلا ناغہ مریضوں کا بول و براز صاف کیا، اُسی اسپتال میں اُس کے مرنے کے بعد سبھی نے اپنا کام بدستور جاری رکھا، سوائے دو جانوروں کے کوئی اُس کی موت کے غم میں سوگوار نظر نہیں آتا۔ دیکھیے یہ منظر:

''اور وہ جب مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کیے، مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آکر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اُٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہِ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپاؤنڈ صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے بیکار چلاتی رہی۔''[6]

ان چند فقروں کے ذریعے کرشن نے سماج پر گہرا طنز کیا ہے۔ دراصل کالو بھنگی کے ذریعے کرشن چندر اس طبقے کی جانب ہماری توجہ دلانا چاہتے ہیں جو مسلسل سماج میں خود غرضی، بے توجہی، احسان فراموشی، ریاکاری، عیاری، بے رحمی اور بے مروتی کا شکار ہوتا آیا ہے۔ کالو

بھنگی کی زندگی کا یہی المیہ ہے کہ سماج کے مختلف افراد کی آنکھوں پر بے حسی، غفلت اور خود غرضی کا وہ پردہ پڑا ہے جہاں اس کے جیسے وفاشعار شخص کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لہٰذا افسانے کے آخر میں اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے افسانہ نگار پورے سماج کو مل کر کام کرنے کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے:

> ''جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہیں کریں گے، کہ کام نہ ہو گا اور تو اسی طرح جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نو لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اُٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت تعمیر نہ کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھوئے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کے پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔''[7]

غرض کہ افسانے کے اختتام پر کرشن چندر اپنے اشتراکی نظریے کی تبلیغ کرتے ہوئے نہیں چوکتے۔ آزادی کے اس نئی طبقاتی کشمکش کو کرشن چندر نے اپنے افسانوں میں بخوبی پیش کیا ہے۔ پانچ روپیہ کی آزادی، سو روپیہ، ایرانی پلاؤ اور دانی بھی اس سلسلے میں اہم افسانے ہیں۔ جس میں کرشن چندر نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ آزادی ملنے کے بعد غریبی دور ہو گی صرف خیال ثابت ہوا اور ادنی طبقے کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دراصل کرشن نے اپنے افسانوں کے موضوعات میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے انسانی دوستی کے نظریے پر سید ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر کا مخاطب ہمیشہ انسان رہا ہے اور مظلوم انسان۔''[8]

محنت کش عوام کے مسائل پر خواجہ احمد عباس نے بھی کئی افسانے لکھے۔ دراصل ترقی پسندی کے دور میں بیشتر افسانہ نگاروں نے سماجی حقیقت نگاری پر قلم اٹھایا اور نچلے کے افراد کی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ بغور کیا۔ اس موضوع پر لکھے افسانوں میں ''شکر اللہ کا'' اور ''سونے کی چار چوڑیاں'' اہم افسانے ہیں۔ یہ افسانے پسماندہ طبقے سے ہمدردی کے جذبے کو ظاہر کرتے ہیں۔ افسانہ ''شکر اللہ کا'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو مسلسل استحصال کا شکار ہوتا آیا ہے اور آخر کار مل میں کام کرتے ہوئے ایک حادثے میں اپنی ٹانگیں کھو بیٹھتا ہے اور بھکاری بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان تمام تکلیفوں کے باوجود خدا کا شکر ادا کرتا دکھائی دیتا ہے:

> ''آپ یہ سن کر حیران ہوں گے سرکار کہ بھیک میں ڈیڑھ دو روپے روز سے زیادہ کما لیتا ہوں۔ پھر جان کھپانے سے کیا حاصل۔''[9]

دراصل افسانے میں خواجہ احمد نے ''ممدو'' کے کردار کے ذریعے مزدور طبقے کے افراد کی سماجی زندگی جو صنعتی ترقی، سرمایہ داروں کی زیادتیوں، مزدوروں کی بے بسی کی وجہ سے برباد ہو چکی تھی، اُس کا بیان ہے۔ ساتھ ہی بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی شعور کے باعث نئے نظامِ حیات میں پیدا ہوئی نئی مشکلات اور بدلتی ذہنیت کا بیان بھی افسانے میں ملتا ہے۔ آزادی کے بعد پیدا ہوئے اس نئے طبقے اور معاشرے پر گہرا طنز ملتا ہے۔

> ''سنتا ہوں ان دس سالوں میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہوئی ہو گی۔ سنتا ہوں لاکھوں ہندو و مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ مارے گئے اور اس کلکتہ کی سڑکوں پر خون کے دریا بہے۔ بہے ہوں گے۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا۔ ہوا ہو گا۔ مجھے تو پتہ نہیں، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک پہلے سے کم ملتی ہے اور بہت سے رحم دل

بابو بھی جب پاس سے گزرتے ہیں اور پیسے دینے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ لے جاتے ہیں تو جیب کو خالی پاتے ہیں۔"[10]

یہ ہیں آزاد ہندوستان کی وہ تصویر جہاں افلاس، غربت اور ذلت نے نہ صرف انسانی زندگی کو بے حس بنادیا اور ساتھ ہی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان کی طبقاتی کشمکش کو بھی نمایاں کیا۔

افسانہ "سونے کی چار چوڑیاں" میں بھی ایک ادنی طبقے کے فرد شنکر کی زندگی کو پیش کیا ہے جس کے جذبات اور خواہشات اسے بری راہوں پر گامزن کر دیتے ہیں۔اُس کی صرف ایک خواہش ہے کہ وہ سونے کی چار چوڑیاں حاصل کر لیں جس سے کہ وہ پاروتی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جائے۔اس کے لیے وہ گاؤں چھوڑ کر بمبئی چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ تمام کام کرنے لگتا ہے جو اُسے برائی کی طرف دھکیل دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کا انسان ابھی مرا نہیں ہے۔ چوری کے لیے ہر رات منصوبہ بنانے والا شنکر جب ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنتا ہے تو لوٹ کے ارادے سے اُس کی طرف جاتا ہے لیکن ایک زخمی لڑکی کو پا کر وہ اسے بچانے کی خاطر تمام سامان جو اس نے جمع کیا تھا پھینک دیتا ہے اور گاؤں کی طرف لڑکی کو ساتھ لیے آگے بڑھتا ہے۔ تمام کوششوں کے بعد جب لڑکی راستے میں دم توڑ دیتی ہے تو شنکر اس کے ہاتھ میں پہنی سونے کی چار چوڑیاں نکال لیتا ہے لیکن جب اس لڑکی کے نزدیک ایک شخص روتے ہوئے آتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس کے ہاتھ میں میری منگنی کی وہ نشانی سونے کی چار چوڑیاں ہوتی تو مجھے اطمینان ہو جاتا۔ جب شنکر کے اندر کا انسان جاگ اٹھتا ہے اور وہ کاغذ میں لپٹی ہوئی چوڑیاں دے کر چلا جاتا ہے۔اس حادثے کے بعد کی زندگی یکسر بدل جاتی ہے اور پاروتی شنکر کا یہ بدلہ ہوا روپ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔افسانے کا اختتام بڑے ہی جذباتی انداز میں ہوتا ہے جہاں سونے کی چار چوڑیوں کے لیے غلط راہ پر بھٹکتے شنکر کو آخر حق کی راہ پر چل کر ہی اُن چوڑیوں کی خوشی پاروتی کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ "ابال"، "تین چوہیں" اور "بیداری کا خواب" وغیرہ افسانوں میں نچلے طبقے کے مسائل، غریبوں کی مسرت اور ناداری کا ذکر ملتا ہے۔بقول عزیز احمد:

"مزدور طبقے کے مصائب کے متعلق انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں بھی بڑا درد اور خلوص ہے اور سستی رقت انگیزی بہت کم ہے۔ان میں طبقاتی کشمکش بھی نظر آتی ہے اور انفرادی نفسیات کا لطیف اور طنز آمیز مطالعہ بھی۔ایسے افسانوں میں "وہ میری منگیتر تھی، تین سو چوبیس اور کاکڑان کا تیلی" بہت دلچسپ ہی۔کاکڑان کا تیلی واقعہ نگاری کا شاہکار ہے۔"[11]

کاکڑان کا تیلی ایک ایسا افسانہ ہے جہاں مولو اپنی غربت اور افلاس کے سبب اپنی بیوی اور بچوں کو تمام آسائش دینے میں ناکامیاب رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے پاس اپنے قریبی حسو کی شادی میں جانے کے لیے پیسے تک نہیں ہوتے جس کے سبب وہ اپنی بیوی اور بچوں کو دوبارہ گھر بھیج دیتا ہے۔اشک نے اس افسانے میں غربت اور بے بسی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ بیدی کا افسانہ "گرم کوٹ" میں بیوی کے شوہر سے محبت کے ساتھ ہی وہ سماجی بدحالی اُبھر کر سامنے آئی جہاں چھوٹی سی انسانی خواہش کو پورا کرنا بھی بے حد مشکل نظر آتا ہے۔

نچلے متوسط طبقے کی زندگی کا نقشہ شاید ہی کسی نے ایسا کھینچا ہوا، اس کا کامیاب ترین نمونہ شاید "گرم کوٹ" ہے۔اس افسانے میں محبت اور معاشی حاجت مندی کی وہ تمام زنجیریں، وہ تمام کڑیاں نمایاں ہیں جو ایک غریب متوسط درجے کے خاندان کے فراد کو ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے لیے قربانی چاہتا ہے۔ بجز بچوں کے جو ابھی اچھی طرح دنیا کے مصائب اور مسائل کو نہیں سمجھتے اور مٹھائی اور کھلونوں کے لیے جائز طور پر ضد کرتے ہیں۔۔۔اس اسانے میں متوسط طبقے کی ہندوستانی بیوی کی سچی محبت اور ہمدردی کی

تصویر ہے، ایک خاندان کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔ جذبات، احساسات، ضروریات، معاشی دشواریوں، محبت اور قربانی کی ایک دنیا آباد ہے۔

اس کے علاوہ افسانہ ''صرف ایک سگریٹ'' حالانکہ انسانی نفسیات کا تجزیہ ہے۔ لیکن اس میں اعلیٰ متوسط طبقے کے مشترکہ خاندان کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور حادثات کا بیان ہے جو سماجی حقیقت کی بہترین مثال ہے۔ آزادی کے بعد اکثر گاؤں والے شہروں کی طرف منتقل ہونے لگے اور زندگی کی دوڑ میں آگے نکلنے کی خاطر کئی مسائل کو دعوت دے بیٹھے۔ انسانی زندگی ایک مشینی زندگی میں تبدیل ہو گئی اور جدوجہد کرتے ہوئے ہی اس کا خاتمہ ہونے لگا۔

حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''موزوں کا کارخانہ'' شہری زندگی کے اُس ہنگامے اور دوڑ دھوپ کی زندگی کا آئینہ ہے۔ جہاں انسان سکون کا متلاشی ہے۔ افسانے میں بمبئی کی اس بے حس مشینی زندگی کا بیانیہ ہے۔ جہاں کسی کو ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں۔ جب ایک ادیب شہروں کی ہنگامی زندگی سے دور ایک ہوٹل میں ٹھہرتا ہے تو ایک بچے کے رونے کی آواز اُسے پریشان کر دیتی ہے لیکن جب اُسے اپنے بچے کی رونے کی اصل وجہ معلوم ہوتی ہے تو اُس کا نظریہ بدل جاتا ہے۔ دراصل افسانے میں انصاری نے مشینی دور کی زندگی کے ساتھ نفسیاتی ردِ عمل کو بھی پیش کیا ہے۔ افسانے میں ایک بچے الارنس کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر اس سماجی زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں انسانی زندگی محدود ہو کر اپنی ذات تک رہ گئی ہے۔ افسانہ ''بھیک'' میں انصاری نے ایسے لاوارث اور یتیم بچوں کی کہانی بیان کی ہے جن کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اس صورتِ حال میں ان کے ساتھ سماج کے مستقبل پر بھی ایک سوالیہ نشان کھڑا نظر آتا ہے۔

افسانہ ''بہت ہی باعزت'' میں انھوں نے ایک نئے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ جہاں اعلیٰ متوسط طبقے کے سرکاری افسروں کی کارستانیوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ دراصل آزادی کے بعد پیدا ہوئی ذاتی طبقاتی کشمکش اور نسلی فرق نے زندگی کا اتنا تلخ اور بوجھل بنا دیا کہ گھریلو اور معاشرتی زندگی متاثر ہونے لگی۔ جس کی عمدہ مثال افسانہ ''آخری کوشش'' ہے۔

سماجی حقیقت نگاری کے سلسلے میں حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''آخری کوشش'' ادب میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اکثر اس افسانے کو پریم چند کے شاہکار ''کفن'' کی ترقی یافتہ شکل مانا جاتا ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''جس افسانے نے حیات اللہ کو قدر اصل کا افسانہ نگار بنایا وہ آخری کوشش ہے۔ آخری کوشش اردو کے چند بہترین افسانوں میں سے ہے۔ اس میں گہرائی، معنویت اور انسان کے بنیادی مسائل کا عرفان ہے۔ یہ افسانہ ایک طرح سے پریم چند کے آخری افسانہ ''کفن'' کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اس میں بھی وہ ٹھہراؤ اور شعور ہے جو پریم چند کے افسانے کا خاصہ ہے۔''[12]

اس افسانے کی معنویت کا اندازہ تو اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کئی مرتبہ اس کا رتبہ کفن سے بھی آگے بڑھ کر ثابت کیا جاتا ہے اور اگر افسانے کے ہر ایک جز پر غور کریں تو یہ دلیل کسی حد تک قابلِ یقین نظر آتی ہے۔

یہ وہ افسانہ ہے جہاں زندگی کی تلخ حقیقت اس طرح ہمارے پیشِ نظر آتی ہے جس کا تصور بھی ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا۔ یہ ایک ایسے طبقے کی محرومی اور استحصال کی کہانی ہے جو گاؤں کی آب و ہوا سے بھی محروم ہے اور شہر کی قابل کراہت زندگی سے مایوس ہو کر انسانیت اور

بوڑھی ماں کی خدمت اور احترام بھول کر اپنی ماں کو بھیک مانگنے کا ذریعہ بنا دیتے ہیں۔ اس دھندے کا آغاز شہر کی ایک مسجد کرتے ہیں۔ جہاں معاشی بدحالی انسان کو ایسے عمل کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جہاں رشتے، ناطے، محبت و اپنا پن سب کچھ بیکار نظر آتا ہے اور فقط انسانی ضرورتیں اپنا سر اُٹھائے نظر آتی ہیں۔ جن کی تکمیل کے لیے انسان تمام حدیں پار کر دیتا ہے۔ افسانے میں دونوں بیٹے بھی معاشی صورتِ حال سے تنگ آکر آخر اپنی ماں کے ذریعے بھیک مانگنے کے اس نئے دھندے میں قدم رکھ دیتے ہیں۔

اگلی کڑی میں غلام عباس کا افسانہ ''چکر'' متوسط طبقے اور اس سے نیچے کی سطح پر زندگی جینے والے ایسے فرد کی کہانی ہے جو جاگیر دارانہ نظام میں غلامی کرنے پر مجبور ہے۔ افسانے میں سیٹھ چھٹامل کا منیم چھلارام ایک کلرک ہے جو اپنی تمام جسمانی ساخت کھو چکا ہے اور دن رات اپنی محنت و جانفشانی سے اپنے سیٹھ کو دولت مند بنا رہا ہے اور خود ایک بے جان شخص سی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ افسانہ نگار نے چھل رام کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے کہ ہمیں تمام تر حالات صاف نظر آتے ہیں:

> ''اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور صورت سے عجیب ہونق پن برس رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں، پلکیں اور بھویں گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ دن بھر لو اور دھوپ کے تھپڑے کھا کھا کر اس کے چہرے کی رنگت ایسی سیاہی مائل سرخ ہو رہی تھی جیسے کہ اس مردے کی جس کے چہرے کی پاس لکڑیوں کی آنچ پہلے پہل پہنچنی شروع ہو۔''[13]

چھلارام اُن ہزاروں لوگوں کا نمائندہ ہے جو اُس مسائل سے دوچار ہیں اور جن کی محنت کا پھل دوسرے لوگوں کے ہاتھوں لگتا ہے۔

ہریجنوں سے متعلق مسائل پر بھی ہمارے کئی افسانہ نگاروں نے قلم اُٹھایا ہے۔ پریم چند نے نجات لکھ کر دبے کچلے اور استحصال کی مار جھیل رہے اس طبقے کی طرف سب کو مرتکز کرنے کی جو کوشش کی تھی، ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس راہ میں مزید قدم بڑھائے۔ حالانکہ اس مسائل پر زیادہ نہیں لکھا گیا لیکن پھر بھی ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ مسائل اکثر اُٹھتے نظر آتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے ''نیری لین کے پتلون اور تین بھنگی'' علی عباس حسینی کا ''لاٹھی پوجا'' اور عصمت چغتائی کا ''دو ہاتھ'' جیسے افسانے لکھ کر ادب میں اس موضوع پر زیرِ بحث لانے کی کوشش کی۔

خواجہ احمد عباس کا افسانہ ''نیری لین کی پتلون'' میں ایک نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے منگو نامی ایک بھنگی کے جذبات اور اپنے بھنگی ہونے کے سبب کی جانے والی ذات پات کی تفریق سے متاثر ہو کر علم حاصل کرنے اور اپنی پہچان تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ایک شخص کی کہانی بیان کی ہے۔ منگو جو تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر اپنا پورا نام بدل کر بمبئی کی ایک کمپنی میں ملازمت کر لیتا ہے۔ وہاں رہتے ایک راجپوت لڑکی سے عشق کرنے اور شادی کی بات کرنے کے لیے جب وہ اس کے والد سے ملتا ہے تو وہ اس بات سے ناراض ہو کر منگو چپڑاسی ہے انکار کر دیتے ہیں۔ تب منگو کو سمجھ آتا ہے کہ ہریجن جیسے الفاظ سے الگ ہو جانا ہی کافی نہیں ہے۔ غرض کہ وہ اسی روپیہ کی نیری لین کی پتلون تک خرید لیتا ہے تاکہ اپنے آپ کو بدل سکے اور بڑی صاحبوں کی مانند اپنی ذات کے نچلے پن اور غلاظت اوپر اٹھ سکے لیکن یہ پتلون بھی اس کی قسمت کو نہیں بدل پاتی۔ افسانے میں ایک شخص کی بے بسی اور سماج کی وہ سچائی ہمارے پیش نظر آتی ہے جو ایک شخص کو ترقی کرنے اور اپنے خوابوں کی تکمیل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ منگو جب ہزار کوششوں کے بعد بھی کامیاب نہیں ہوتا تو مایوس ہو

جاتا ہے۔ اسٹیشن پر جانے کے لیے دکان پر کھڑے ہو کر اس نے سامنے لگے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ بالکل صاحب لگتا ہوں۔ آسمانی رنگ کے دس روپے کی شرٹ، اسی روپیہ کی نیری لین کی پتلون۔ مجھ میں کیا برائی نظر آئی۔

دراصل یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نچلے طبقے کی ہزاروں کوششوں کے باوجود اُس کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی سوائے اُسے پکارے جانے والے نام کے۔ حالانکہ آزادی کے بعد سماج میں کئی تبدیلیاں آئیں لیکن ذات پات کی تفریق آج بھی ملک میں موجود ہے۔ اس کا عکس افسانہ ''تین بھنگی'' میں آزادی کے بعد ہریجنوں کو فاہم کی گئی سہولتوں کا بیان ہے جس سے متاثر ہو کر کئی براہمن اور مسلمان جوان لوگوں کے سخت مخالف تھے وہ لوگ اب زیادہ تنخواہ حاصل کرنے کی لالچ میں اُن کے پیشے کو اختیار کرنے لگے تھے۔ دراصل خواجہ صاحب نے اس افسانے میں طنزیہ اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے بدلتے سماج اور ہریجنوں کے حقارت آمیز رویہ کا بیان کیا ہے۔

علی عباس حسینی کا افسانہ ''لاٹھی پوجا'' میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس افسانے میں آزادی کے بعد بدلی سماجی زندگی اور ہریجنوں کی ترقی یافتہ زندگی کی پیش کش کی گئی ہے۔ اب اُن کی زمینوں پر ان کا اقتدار تھا لہٰذا بخوشی مکان کی رقم حکومت کو ادا کرنے میں وہ پریشانی محسوس نہیں کرتے۔

عصمت چغتائی کا افسانہ ''دو ہاتھ'' میں نچلے طبقے کی اس حقیقت کو پیش کیا ہے جو سماجی ذلت کے پرے ہے۔ گوری کے رام اوتار کے جنگ پر چلے جانے کے باوجود بچے کو جنم دینا اور رام اوتار کا اس کے باوجود بچے کو اپنا لینا اسی بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس طبقے کے پیشِ نظر مالی مسائل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بجائے کے ذالت اور نیک نامی کے۔ رام اوتار کے جذبات کے متعلق فضیل جعفری رقم طراز ہیں:

> ''یہ وہ موڑ ہے کہ جہاں عصمت پوری شدت کے ساتھ افسانوی معنی کی ترسیل کر دیتی ہیں۔ رام اوتار بے حس نہیں ہے لیکن غربت اور غیر محفوظ مستقبل اسے بے غیرت بنانے اور حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''[14]

ان تمام افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہی نتائج اخذ ہوتے ہیں کہ اردو افسانے میں تیسرا بڑا رویہ اسی احتجاج سے عبارت ہے جسے سیاسی و معاشی نظام کے تضادات کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ جن میں ان خوابوں کی شکست کا شور شامل ہے۔ جو آزادی سے قبل ایک صحت مند زندگی اور روشن مستقبل کے خواب کے تصورات سے وابستہ تھے۔ دراصل اردو افسانے میں نمایاں ہونے والا یہ رویہ آزادی کے بعد سماج میں ہونے والی ان تبدیلیوں سے عبارت ہے جس نے اگر فرد و سماج کے ذہنی انتشار، تنہائی کے کرب اور خوف میں مبتلا کر دیا ہے تو ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو نئے تناظر میں سمجھنے اور نئی سمت میں پیش رفت جاری رکھنے کے عمل کو بھی تقویت پہنچائی ہے لیکن بدلتے اس ماحول نے ہمارے گاؤں کے تصور کو بدل کر رکھ دیا اور کئی لوگ گاؤں اور دیہات سے نکل کر شہری زندگی کی جدوجہد میں داخل ہونے لگے جہاں ہر دم چمنیوں سے نکالنے والے دھوئیں، بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور مقابلہ کی آندھیوں نے فرد کو فرد سے اس طرح بیگانہ کر دیا کہ ہر لمحہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانے کے خوف، عدم استحکام، غیر یقینی مستقبل، بے سمتی اور بے چارگی نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ اس نئے صورتِ حال نے ہمارے سماج اور ادب کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کا اظہار نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے یہاں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

حوالہ جات:

1 کرشن چندر، دسواں پل، (دلی: ایشیاء پبلشرز، اکتوبر 1964ء)، ص123
2 ایضاً، ص118۔119
3 اطہر پرویز، اردو کے تیرہ افسانے، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1983ء) ص36۔37
4 اطہر پرویز، کرشن چندر اور ان کے افسانے، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1986ء) ص7
5 ایضاً، ص126۔127
6 ایضاً، ص132
7 ایضاً، ص141
8 سید ممتاز حسین، نئے تنقیدی گوشے (دہلی: آزاد کتاب گھر، 1964ء) ص231
9 رام لعل، خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے، (نئی دہلی: آزاد کتاب گھر، 1988ء) ص228
10 ایضاً، ص230
11 عزیز احمد، ترقی پسند ادب، دہلی، ص106
12 خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2002ء) ص214
13 غلام عباس، آنندی، (لاہور: مکتبہ جدید، 1955ء) ص164
14 گوپی چند نارنگ، مرتبہ: اردو افسانہ روایت اور مسائل، ص432۔433